© rasailojaraid.com

امجد طفیل

تہذیب وثقافت کو درپیش خطرات

پاکستانی معاشرہ جس خلفشار اور بحران کا شکار ہے، اُس کے نظریاتی، سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل بہت واضح ہیں۔ پاکستانی معاشرے کی بحرانی صورتِ حال نے تہذیب وثقافت میں نفوذ کرتے ہوئے صورتِ حال کی شدت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ تہذیب وثقافت اور انسانی قدروں کی پائمالی ہر روز ہمارے مشاہدے میں آتی ہے۔ سماجی اقدار اور اخلاقی معیارات کی شکست وریخت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہمارے نظامِ معاشرت کا کوئی ادارہ وہ کام کرتا دکھائی نہیں دیتا جس کے لیے اُس کی تشکیل کی گئی ہے۔ معاشرتی اور انتظامی اداروں کا انحطاط اُس سطح کو چھو رہا ہے جہاں نظامِ انتظام کے نہ ہونے کا احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے۔ مثلاً حکومت نے معاملات کو درست انداز میں چلانے کے لیے جو مختلف شعبے تشکیل دے رکھے ہیں، وہ ان شعبوں میں کام کرنے والے اہل کاروں اور آفیسران کے مفادات اور ترجیحات کے تحفظ کا فریضہ تو انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ''حکومتی رِٹ'' بحال رکھنے میں اُن کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔

''تہذیب وثقافت کو درپیش خطرات'' کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کر کے ہمیں موجودہ عہد کے سب سے اہم معاملے کو زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ جب ہم تہذیب وثقافت کو درپیش خطرات کی بات کرتے ہیں، تو یہ اُس طرح کی صورتِ حال نہیں ہے جیسے ہمیں اسلام، نظریۂ پاکستان یا اب روشن خیالی اور لبرل انسانیت پسندی ہر وقت خطرے میں نظر آتی ہے۔ تہذیب و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثقافت کو درپیش خطرات ہماری دانشورانہ کتاب کا سب سے اہم ورق ہے۔ ہمیں اس موضوع پر بات کا آغاز بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا۔

میرا تعلق شہر لاہور سے ہے۔ وہ شہر جو چار دیواری کے اندر آباد تھا جسے ابنِ انسان نے پاکستان کا سب سے بڑا دیہات کہا تھا۔ وہی شہر لاہور جو عالم میں انتخاب تھا، پاکستان کا ثقافتی مرکز کہلاتا تھا اور جس کے باسی اپنے طرزِ زندگی کے باعث ''زندہ دلانِ لاہور'' کہلاتے تھے۔ لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نہ وہ لاہور رہا، نہ لاہور کی وہ تہذیب وثقافت اور نہ ہی وہ اہلِ لاہور۔ رفتہ رفتہ سب مٹ گیا۔ اِسے کمرشل ازم اور سرمایہ داری کا عفریت بہا کر لے گیا اور ہم سب اس کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے جمی جمائی تہذیب اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے اور ہم بے حس بنے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ شاید یہ بے حسی کا رویہ ہے جس سے تہذیب وثقافت کو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے۔

مَیں شہر لاہور کے جس علاقے میں رہتا تھا، اُس کی مرکزی سڑک کا نام کشمیری بازار ہے۔ یہ دہلی گیٹ سے شروع ہو کر مسجد وزیر خان سے ہوتے ہوئے سنہری مسجد سے ذرا آگے نکل کر پانی والا تالاب سے آنے والی سڑک سے جڑ جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اس سڑک کی تاریخی، تہذیبی اور کاروباری حیثیت متعین ہے۔ جس محلے کا مَیں رہنے والا ہوں اسے کٹڑہ باشی کہتے تھے، اب یہ نام صرف سرکاری کاغذات میں ملے گا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ۱۹۷۷ء میں جب بھٹو کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو شہر لاہور میں کرفیو لگا دیا گیا۔ اس محلے کی تعمیر اس طرح تھی کہ تقریباً گول دائرے میں چاروں طرف گھر بنے تھے۔ درمیان میں مسجد تھی۔ محلے میں آنے کا ایک راستہ تھا جس پر دروازہ لگا تھا۔ کرفیو کے دنوں میں اس بھاری بھرکم دروازے کو بند کر دیا گیا۔ اندر بچے، عورتیں اور مرد کھیلوں، گھریلو کام اور اپنی اپنی دلچسپی کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اب یہ سارا محلّہ پلازوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایک آدھ گھر باقی ہے لیکن کب تک۔ یہ سب کچھ اس لاہور میں ہوتا رہا اور ہمارا دانشور چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہا۔ لاہور کے ثقافتی ادارے، میلے ٹھیلوں کی جگہیں ایک ایک کر کے کاروباری معاملات کی نظر ہوتی رہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ہم چپ چاپ دیکھتے رہے۔ آپ بلاشبہ اِسے میری قدامت پسندی اور دقیانوسیت کی عکاس سوچ قرار دے سکتے ہیں مگر اس کا کیا کیا جائے کہ تہذیب و ثقافت قدامت سے مستحکم ہوتے ہیں۔ ان میں نئی چیزیں، علامتیں اور باتیں اپنی جگہ بناتی ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ پرانی شناخت ہی مٹ جائیں اور اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ تہذیب و ثقافت اُن لوگوں کے باعث زندہ رہتی ہیں جو اس میں رچے بسے ہوتے ہیں اور جن میں یہ رچی بسی ہوتی ہیں۔ جب آپ لوگوں کو اُن کی جڑوں سے اُکھاڑ دیتے ہیں تو تہذیب و ثقافت خود بخود مٹ جاتی ہیں۔ یہاں آپ بجا طور پر سوال پوچھ سکتے ہیں کہ پھر ترقی کا پہیہ آگے کیسے چلے گا۔ ضرور چلے گا، اس کے لیے ہم اُن ترقی یافتہ ممالک سے سیکھ سکتے ہیں جن کی ترقی، روشن خیالی اور اعلیٰ انسانیت پسند تصورات کی مالا ہم دِن رات جپتے ہیں اور اسے اپنے لبرل، سیکولر اور روشن خیال ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سنی سنائی باتوں پر گزارا کرتے ہیں لیکن سیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں، صرف اس بات کا مطالعہ کر لیں کہ برطانیہ میں قدیم ورثے کا تحفظ کیسے کیا گیا اور قدیم علاقوں اور عمارتوں کو باقی رکھتے ہوئے جدید شہر کیسے بسائے گئے ہیں۔ بلا سوچے سمجھے بغیر منصوبہ بندی کیے کچھ باتوں کے پیچھے دوڑتے چلے جانے کا ہمارا رویہ ہے جس سے ہماری تہذیب وثقافت کو شدید خطرہ ہے۔

آپ مجھ سے یہ سوال بجا طور پر کر سکتے ہیں کہ جب یہ سب ہو رہا تھا تو میرا ردِّ عمل کیا تھا؟ میرا ردِ عمل بڑا سادہ تھا۔ پہلے تو میں چپ چاپ یہ سب دیکھتا رہا۔ صبح کے وقت شہر سے گزرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ بڑی بڑی مارکیٹیں پھیلتی رہی۔ رہائشی علاقے سکڑتے رہے۔ لوگ صدیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی گزارتے ہوئے ایک ایک کر کے علاقہ بدر ہوتے رہے۔ رہ جانے والے، جانوں والوں کو حسرت، تاسف اور ملال سے دیکھتے رہے۔ خود میرا خاندان کٹڑہ باشی میں تین پشتوں سے آباد تھا۔ دوسرے گھرانوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا اور بعض علاقوں میں تو لوگ صدیوں سے آباد تھے۔ ایک ایک کر کے جگہ خالی کرتے رہے۔ پلازے، دُکانیں اور گودام بڑھتے رہے، رہائشی علاقوں میں رہنا مشکل ہوگیا۔ لوگ شہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہوتے رہے۔ ایک دن میں نے بھی اپنا سامان اُٹھایا، والدین کو لیا اور علی پارک سمن آباد میں آ بسا۔ اس کے علاوہ مَیں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مَیں اس تجارتی اور کاروباری دباؤ کا سامنا کیسے کرتا۔ اس صورتِ حال میں اپنے تحفظ کے لیے کسے وکیل کرتا، کس سے منصفی چاہتا۔ اگر میں تھانہ، کچہری جاتا تو جو میرا حشر ہوتا، آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ حکومت کے دوسرے اداروں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ہمارے سرکاری اداروں کے کرپٹ اور نااہل افسران اور اہل کار وہ بڑا خطرہ ہیں جس کے سامنے تہذیب و ثقافت بے دست و پا نظر آتی ہے۔ سرکاری محکموں میں بیٹھے لوگوں کی اکثریت اپنی ذاتی اغراض کے تحت کام کرتی ہے، جس کے نتیجے میں حکومتی عمل داری، رشوت، سفارش، بداعمالی اور نااہلیت کی یرغمال بن چکی ہے اور کسی سماجی، تہذیبی یا تخلیقی عمل میں معاونت کرنے کے قابل نہیں رہی ہے۔

لاہور شہر میں ایک اہم تہوار ''بسنت'' ہے جو صدیوں سے یہاں منایا جاتا رہا ہے۔ کیا اس کا تعلق ہندومت سے ہے یا یہ ایک موسمی تہوار ہے؟ یہ بحث بھی بہت پرانی ہے۔ اس کے باوجود لاہور میں بسنت منانے کا سلسلہ چند سال پہلے تک جاری تھا۔ کوئی مذہبی گروہ، کوئی نقطۂ نظر لاہور کے رہنے والوں کو بسنت منانے سے نہیں روک سکا تھا، مگر پھر رفتہ رفتہ اس میں تجارتی اور کمرشل مفادات شامل ہونا شروع ہوئے۔ اب بسنت کب ہوگی اس کا فیصلہ موسم نہیں کائیٹ ایسوسی ایشن کرتی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کس وقت اُن کے تجارتی مفادات زیادہ تسکین پا سکتے ہیں۔ مَیں بسنت منانے کا مخالف نہیں۔ خود میری انگلیوں پر ڈور سے کٹنے کے نشانات موجود ہیں۔ چند سال پہلے جب حکومت نے پتنگ اُڑانے کے لیے اجازت نامے کا حصول لازمی قرار دیا تو مَیں نے خود اپنے سات سالہ بچے کے لیے وہ اجازت نامہ حاصل کیا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ خوشی کے اس تہوار میں اب معصوم بچوں کا خون بھی شامل ہونے لگا ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی تہوار کے نتیجے میں لوگوں کا خون بہانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کائیٹ ایسوسی ایشن جو بڑے بڑے اخباری بیانات جاری کرتی ہے، کیا عدالت میں یہ لکھ کر دینے کو تیار ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈور لگانے والا کوئی فرد تیز دھار کیمیکل شامل نہیں کرے گا اور اگر کسی بچے کی گردن کٹے گی تو قتل کا مقدمہ ایسوسی ایشن کے عہدیدار یا بسنت منانے کے حامیوں کے خلاف کٹے گا۔ بسنت منانے کی حمایت ثقافتی تہوار کی آڑ میں کی جاتی ہے۔ لیکن لاہور شہر میں کتنے ثقافتی تہوار اور ثقافتی علامتیں تھیں جو مٹ گئیں اور اُن کے لیے کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ یہاں دراصل تجارتی مفادات اور منافع خوری کی وہ گھٹیا حرص ہے جو اصل میں تہذیب وثقافت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

عالمی سطح پر، عالمگیریت وہ مظہر ہے جس نے اس وقت ساری دُنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ دُنیا کے ہر معاشرے میں عالمگیریت کے حامی اور مخالفین موجود ہیں۔ عالمگیریت کے حامی کہتے ہیں کہ دُنیا ایک ''گلوبل ولیج'' میں ڈھل رہی ہے۔ ذرائع نقل وحرکت اور رسل ورسائل نے ساری دُنیا کو ایک وحدت میں پرو دیا ہے۔ آج کا انسان دوسرے علاقوں اور قوموں سے الگ ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ الیکٹرونک میڈیا اور کمپیوٹر، انٹرنیٹ نے لوگوں میں ایسی قربت پیدا کر دی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عالمگیریت عہدِ حاضر کی روح ہے جس سے گریز ممکن نہیں وغیرہ وغیرہ۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عالمگیریت کے پردے میں مغربی، استعماری قوتیں جن کا سربراہ امریکا ہے، اپنے طرزِ زندگی اور اپنی طرزِ ثقافت کو ساری دُنیا میں مسلط کر رہی ہوں تاکہ وہ بلا مزاحمت ساری دُنیا کے وسائل پر قبضہ کر سکیں۔ عالمگیریت، عالمی استعمار کا ثقافتی ایجنڈا ہے۔ اقتصادی ایجنڈا ملٹی نیشنل کمپنیاں اور Transnation Capital ہے۔ اور عالمی استعمار کا سماجی محاذ NGOs ہیں جو تیسری دُنیا میں حکومتی اداروں کے متوازی ادارے بنا کر حکومتی عمل داری کو کمزور کرتی ہیں۔ فکری سطح پر عالمی استعمار Post-Modernism کے فلسفے کو آگے بڑھنا ہے جس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ساری دُنیا میں عظیم بیانیہ (Great Narrator) ختم ہو چکا ہے۔ قومی شناخت کی جگہ علاقائی شناخت کو اُبھارا جا رہا ہے۔ قومی زبان کی جگہ مقامی زبانوں کو سامنے لایا جا رہا ہے۔ ایک عالمی زبان، ایک مقامی زبان درمیان میں کچھ نہیں۔ مابعد جدیدیت، لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کر رہی ہے کہ وہ اپنی قومی شناختوں پر اصرار چھوڑ دیں۔ اپنے ثقافتی ورثے میں سے اُن عناصر کو منتخب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں جو محدود نوعیت کے ہیں۔ کوئی عظیم بیانیہ موجود نہیں۔ ہاں عالمگیریت موجود ہے جو شاید عظیم عظیم بیانیہ (Great - Great Narrator) ہے۔ عالمی ثقافت، عالمی زبان، عالمی طرزِ معاشرت اپنا لیا جائے گا تو دُنیا عالمگیریت کے مظہر کا نمونہ بن جائے گی۔ تب شاید دُنیا کے نقشے پر موجود جغرافیائی سرحدوں کو بدلنے کی اتنی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ عالمگیر ثقافت، مذہبی، ثقافتی، جغرافیائی اور لسانی اختلافات کو نگل چکی ہوگی۔

ہمیں استعماری ایجنڈے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ سرمایہ کو ملکی حدوں کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے دُنیا میں ترقی کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ترقی سرمائے سے ہوتی ہے یا اس کے لیے انسانوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ آزاد منڈی کی معیشت پابندیاں برداشت نہیں کرتی لیکن انسانوں کی نقل و حرکت پر بدترین پابندیاں اسی آزاد معیشت میں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ اگر سرمائے کے لیے سرحدیں کھولی جاسکتی ہیں تو انسانوں کے لیے کیوں نہیں۔ اگر انسانوں کی آزادانہ نقل و حرکت سے ترقی یافتہ ممالک سماجی و تہذیبی ادارے متاثر ہوتے ہیں۔ آبادی کا نسب و تناسب درہم برہم ہوتا ہے تو سرمائے کی آزادانہ نقل و حرکت سے ترقی پذیر ممالک شدید متاثر ہوتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سالوں میں سرمائے کی نقل و حرکت سے ''ایشین ٹائیگر'' کی ہوا نکلتے دیکھی ہے۔ سرمائے کی نقل و حرکت کو آزادانہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ چند سرمایہ کاروں کے مفاد میں ہے لیکن انسانوں کی نہیں کیونکہ یہ سرمایہ کاروں کے مفاد میں نہیں۔ یہی معاشی عالمگیریت ہے۔

ثقافتی عالمگیریت کی ایک مثال ہمیں ''ویلن ٹائن ڈے'' کی شکل میں نظر آتی ہے، جسے سرمائے اور تشہیری ذرائع کے زور پر ساری دُنیا میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اس دن کو منانے کے لیے بڑی سادی دلیل دی جاتی ہے کہ یہ تو محبت کو عام کرنے کے لیے ہے۔ اس دن کے حوالے سے جو متضاد کہانیاں آپ کو ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ سے دستیاب ہیں، اُن پر بھی بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ دیکھیں کہ عالمگیریت کے نام پر مشرقی ثقافتوں میں سے کتنی علامتوں کو قبول کیا جا رہا ہے۔ مشرق میں تین بڑی اسلامی تہذیب، ہندو تہذیب، بدھ تہذیب موجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ ان تہذیبوں کی کتنی علامتوں کو عالمگیریت کے ثقافتی مظاہر کے مرکز میں جگہ دی گئی ہے۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ لندن میں رہنے والے ہندو دیوالی مناتے ہیں اور امریکا میں رہنے والے مسلمان عید مناتے اور عاشورہ کا جلوس نکالتے ہیں۔ یہاں بات کسی تہذیبی مظہر کو بطور علامت قبول کرنے کی ہے۔ اگر عالمگیریت یک طرفہ عمل ہے اور یہ ہے تو پھر یہ مغربی استعماریت کو قابلِ قبول بنانے کا عمل تو ہو سکتا ہے، ساری دُنیا کے لوگوں کو مساوی سمجھنے کا نہیں۔ لوگوں کو برابری کا درجہ دینا اور بات ہے اور انھیں ایک رنگ میں رنگنا دوسری بات۔ ثقافتی عالمگیریت لوگوں کو ایک خاص رنگ میں رنگنے سے عبارت ہے اور اس سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کی ثقافتوں کو شدید خطرات درپیش ہیں۔

تہذیب وثقافت کو درپیش خطرات میں بلاشبہ ایک بڑا خطرہ انتہاپسندی سے ہے۔ انتہاپسندی کسی بھی نوعیت کی ہو، وہ تہذیب وثقافت سے متصادم ہوتی ہے۔ فکری انتہاپسندی ہو یا نظریاتی، سیاسی انتہاپسندی ہو یا لسانی، اپنی اصل میں تہذیب وثقافت مخالف ہوتی ہے۔ مذہبی انتہاپسندی بھی اس حوالے سے کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں ہمارے معاشرے میں مذہبی انتہاپسندی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس نے شدت پسندی کو فروغ دیا ہے اور اس میں تشدد اور دہشت گردی بھی شامل ہوئی ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پاکستانی معاشرے نے فرقہ وارانہ انتہاپسندی کے مظہر کو بڑی شدت سے برداشت کیا۔ ۲۰۰۱ء میں ہم دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے اور اس جنگ کو اپنے دروازوں کے اندر لے آئے۔ لیکن یاد رہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے ہمارے معاشرے میں انتہاپسندی اور شدت پسندی کے عناصر کو زیادہ مضبوط کیا ہے۔ ترقی پذیر معاشروں میں مذہبی انتہاپسندی، عالمگیریت کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر سامنے آئی ہے جو استعماری قوتوں کے استحصال کے خاتمے کی آواز اُٹھاتی ہے۔ اس لیے حکومتی اور عالمی ذرائع ابلاغ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ عام آدمی کے اندر انتہاپسندوں کے خلاف ردِعمل پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ہمیں حکمران اشرافیہ عالمگیریت کی کھلی یا درپردہ حمایت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی حال استعمار پسند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دانشوروں کا ہے جو روشن خیالی، لبرل ازم، سیکولرازم انسان دوستی وغیرہ کے خوش کن نعروں کے پردے میں استعماری ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس ایجنڈے کو شدید مزاحمت انتہا پسند طبقے کی طرف سے آتی ہے جو مذہب کے حوالے سے ہمارے یہاں منظم ہے۔ اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود عالمگیریت کے حامی اور مذہبی انتہا پسند دونوں تہذیب و ثقافت کو نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی حکمتِ عملی اور طریقہ کار میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن اس سے ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

دانشوروں کی ایک مخصوص لابی کی طرف سے جب طالبان کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد لوگوں کو خوفزدہ کر کے اس بات کے لیے آمادہ کرنا ہوتا ہے کہ لوگ استعماری ایجنڈے کی حمایت کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ امریکی استعمار نے گزشتہ چند سالوں میں کروڑوں ڈالر میڈیا اور استعمار پسند دانشوروں میں تقسیم کیے ہیں اور طرح طرح کی تنظیمیں بنائی گئی ہیں تا کہ مختلف لیبل لگا کر ''مخصوص نظریات'' فروخت کیے جاسکیں۔ لیکن رائے عامہ کے جائزے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پوری دُنیا میں بالعموم اور مسلم معاشروں میں بالخصوص ان مخصوص معاملات کی پذیرائی بہت کم ہوئی ہے۔ جب روشن فکر دانشوروں کے سامنے اس صورتِ حال کو پیش کیا جاتا ہے تو اُن کی صورت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جمہوریت کے حامی ہونے کے باوجود وہ برملا لوگوں کو جاہل، کم عقل قرار دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ جاہل اور کم عقل لوگ ہی ہیں جن کے فیصلے جمہوریت کہلاتے ہیں۔ ایسے میں وہ اشرافیت پسند (Elitist) فکر کے نمائندے بن جاتے ہیں جن کے پاس روشن فکری، عقلیت پسندی، انسانیت پسندی جیسی ادویات موجود ہیں جن سے علاج کرنا چاہتے ہیں۔ جب انہیں ان دانشوروں کی مثال دی، جنھوں نے سیکولر، لبرل ہوتے ہوئے عالمی استعمار کے خلاف آواز اُٹھائی ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگتے ہیں۔ خود میری موجودگی میں ایک ممتاز روشن فکر دانشور نے اس بات کی مخالفت کی کہ ایڈورڈ سعید کی کتاب ''Cover Islam'' کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے۔ بقول استعمار پسند، انگریزی زدہ دانشور، ایڈورڈ سعید جیسے لوگوں کی مدد سے ''اُن'' جیسے روشن فکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دانشوروں کو مارا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت اصل میں یہ ہے کہ استعمار پسند دانشور، استعماری ہتھ کنڈوں کی حمایت سیکولر، لبرل ازم کے لبادے میں کرتے ہیں اور جب ایڈورڈ سعید جیسے لوگوں کی تحریریں اُن کے چہرے سے نقاب اُتار دیتی ہیں۔ اُن لوگوں کا اصل چہرہ سب کے سامنے لے آتی ہیں۔

چند دن پہلے ایک دانشور نے ایک تقریب میں یہ فرمایا کہ اب تو یہ فیشن بن گیا ہے کہ امریکا اور استعمار کو برا کیا جائے۔ لوگوں نے بڑی حیرت سے اُسے سنا۔ وہ صاحب یہ بھول گئے کہ فتنے تو اشرافیہ ایجاد کرتی ہے اور اشرافیہ چاہے پاکستان کی ہو، امریکی استعمار کی مخالف نہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے صاحب نے فرمایا کہ اب امریکا استعمار نہیں رہا۔ کیونکہ اب استعمار اصل میں ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ ایسا ردِعمل دراصل اُس حلقے کی طرف سے آتا تھا، جو کبھی سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہوتا تھا اور سویت یونین کے خاتمے کے بعد NGOs کا تنخواہ دار بن گیا۔ اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اصل استعمار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں تو اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ جب یہ کمپنیاں ڈوبنے لگتی ہیں تو ۷۰۰ ارب ڈالر کا بیل آؤٹ پیکیج کون لاتا ہے۔ جب ان کمپنیوں کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، تو بحری بیڑا کس کا حرکت کرتا ہے۔ اُن فوجیوں کو تنخواہیں کون دیتا ہے جو استعماری ایجنڈے کی تکمیل کے لیے نکلتے ہیں۔ ظاہر ہے اس بالائی ساخت (Super Structure) کا کوئی نام تو ہوگا۔ عہدِ حاضر میں وہ نام ریاست ہائے متحدہ امریکا ہے۔

غیر ملکی مسلح مداخلت اور اُس کے جواب میں مسلح مزاحمت نے ہمارے پورے سماجی ڈھانچے کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے۔ اس سے ہمارے سماجی اور انتظامی ڈھانچے کے نقائص پوری طرح کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ ہمارا ریاستی ڈھانچہ اُس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں جو اُسے دونوں اطراف سے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمیں افغانستان کے بعد پاکستان میں مسلح تصادم کے نتیجے میں اپنے سرکاری ادارے ناکام اور پیچھے ہٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کرپٹ اور نااہل انتظامیہ میں اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوعیت کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی نہ تو سکت ہے، نہ صلاحیت۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک میں طالبان کس علاقے سے بنے۔ انتظامی اصطلاح میں اسے فاٹا کہا جاتا ہے اور گذشتہ ۶۲ سال سے ان علاقوں میں پاکستانی قانون کی عمل داری نہیں۔ یہاں کے ملک اور سردار بااختیار ہیں۔ قبائلی طرزِ معاشرت میں لوگ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ صنعتی ترقی اور روزگار کے مواقع محدود ہیں۔ سماجی ترقی کے نام پر قبائلی سرداروں کو نوازا جاتا رہا ہے جس کے باعث وہاں کا عام آدمی محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ ہم نے ایک لمبے عرصے تک اس بات کی حوصلہ افزائی کی کہ وہاں کے لوگ سمگلنگ کے ذریعے روزگار کمائیں۔ اس کے ساتھ پوست کی کاشت، اُس سے بننے والی افیون، چرس اور پھر ہیروئن ہی لوگوں کی معاش ہو۔ ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد سے ان علاقوں میں جہاد اور جنگ ایک نئے عامل کے طور پر داخل ہوئے۔ اسلحہ پہلے بھی ان علاقوں میں تیار کیا جاتا تھا، اب کھلے عام اس کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سویت فوجوں کے جانے کے بعد جب افغانستان میں مجاہدین نے حکومت بنائی تو امریکی ایما پر پشتو آبادی کے نمائندے گلبدین حکمت یار کو اقتدار سے دُور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ حکمت یار افغانستان کا وزیرِاعظم تھا لیکن احمد شاہ مسعود اُسے کابل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس چپقلش نے کابل میں مرکزی حکومت کو کمزور کیا اور علاقائی سرداروں کو مضبوط کیا جنہوں نے من مانیاں شروع کر دیں۔ اس صورتِ حال میں افغانستان میں طالبان ظاہر ہوئے۔ اُن کے روابط پاکستان میں بھی تھے۔ جب ۲۰۰۲ء میں امریکا نے طالبان حکومت ختم کی تو طالبان کابل سے نکلے، اُن کی قدرتی پناہ گاہ پشتون علاقے تھے۔ یہ علاقے پاکستان کی سرحد کے ساتھ واقع ہیں۔ اور دونوں طرف کے لوگوں میں قبائلی اور خاندانی رشتے داریاں ہیں جس سے صورتِ حال مزید پیچیدہ ہو گئی۔ اس میں ایک اور عوامل عرب ممالک اور دیگر ممالک سے آنے والے مجاہدین کا ہے جو ان علاقوں میں آباد ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان سے نظریاتی اور مذہبی یگانگت رکھنے والے افراد ہیں جنہوں نے ان جہادی تنظیموں سے عسکری تربیت لے رکھی ہے۔ ان پر جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکا نے دباؤ ڈالا تو یہ پیچھے ہٹے۔ پیچھے ہٹتے ہوئے طالبان کو سرحد کے اُس طرف تباہ کرنے کی بجائے امریکی اور نیٹو افواج نے انہیں پاکستانی سرحد کے اس طرف آنے دیا تاکہ جنگ کو پاکستان کے اندر دھکیل کہ وہ اپنا کام آسان کرلیں اور باقی کام پاکستانی فوج کرے۔

اس ساری صورتِ حال میں جب پاکستانی فورسز نے ان کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا تو اس کا ردِعمل آیا۔ یہ ردِعمل اتنا شدید تھا کہ اب تک قابو میں نہیں آ رہا۔ بلکہ رفتہ رفتہ اس کا دائرہَ کار بڑھ رہا ہے۔ جیسے جیسے فاٹا کے علاقوں میں ان عناد پر دباؤ بڑھے گا تو یہ لوگ بندوبستی علاقوں میں آئیں گے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ طالبان آ رہے ہیں تو مجھے اس سے اس لیے اتفاق نہیں کہ طالبان امریکی فوج نہیں جسے باہر سے آنا ہے۔ وہ اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہم نے انتظامی اور سیاسی سطح پر جو گذشتہ ۶۰ سالوں میں کیا ہے، اُس نے طالبان کے لیے اس زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ جن علاقوں کو ہم نے معاشی اور سماجی ترقی کے عمل سے پیچھے رکھا تھا، وہ اب اپنے انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں چونکہ اُن کا طرزِ زیست، قبائلی ہے۔ مذہب اسلام کی اُن کی اپنی تشریح ہے اس لیے ہماری اشرافیہ اُن کی پیش قدمی سے شدید خالف ہے۔ اب انہیں تہذیب وثقافت خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں تہذیب وثقافت سے مراد لوگوں کی تہذیب وثقافت نہیں کیونکہ اس کی پرواہ کسے ہے۔ تہذیب وثقافت سے مراد اشرافیہ کے طرزِ زیست کا وہ مغلوبہ ہے جو گذشتہ پندرہ، بیس سالوں میں عام ہوا ہے اور وہ طرزِ زیست ہے جو ایک، دو فیصد کا حصہ ہے۔

''تہذیب وثقافت کو درپیش خطرات'' کے حوالے سے آخری بات یہ عرض کردوں۔ اسلام کی جو تشریح طالبان یا اُن کے مسلک کے لوگ کرتے ہیں، وہ پاکستان کی آبادی کی اکثریت کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ اسلام وہ مذہب ہے جس نے اس کرہَ ارض پر موجود عظیم ترین تہذیبوں میں سے ایک کو پیدا کیا۔ ہندوستان اور انڈونیشیا سے سپین تک ایسے تہذیبی نمونے پیدا کیے جو آج بھی قابلِ تقلید ہیں۔ اس لیے مذہب اسلام میں تہذیب وثقافت سے مخاصمت کا وہ عنصر موجود نہیں جو بظاہر ایک مختصر کی اقلیت کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ پاکستانی عوام کی اکثریت دو محدود اقلیتوں کے درمیان پس رہی ہے۔ ایک طرف امریکی استعمار ہے جو فوجی ساز و سامان اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کے بل پر اس خطے میں اپنے استعماری ڈیزائن کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف مذہبی انتہاپسندوں کی اقلیت ہے جو امریکی استعمار کی مخالف تو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ فکری سطح پر مذہب کی ایک مخصوص تعریف کرتی ہے۔ جہاں تک اس طبقے کی طرف سے امریکی استعمار کی مخالفت کی بات ہے اُس کی کھل کر حمایت کرنا چاہیے لیکن اگر یہ مذہبی اور ثقافتی معاملات میں تنگ نظری کو رواج دینے کی بات کریں تو اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پاکستانی عوام کی اکثریت کے نقطۂ نظر کو قبول کریں اور دونوں میں سے کسی بھی اقلیت کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے انکار کر دیں کیونکہ یہ بات طے ہے کہ چاہے طالبان ہوں یا استعمار پسند دانشور، دونوں ہی لوگوں کی تہذیب وثقافت کے لیے حقیقی خطرہ ہیں۔

© rasailojaraid.com